349

فکرِ اقبال کا ابتدائی ثروت خیز دَور

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ڈاکٹر محمد ریاض

375

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

(اقبال)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۱ء کا ہفت سالہ دورِ فکرِ اقبال کا حیرت انگیز حد تک ثروت خیز دَور ہے۔ اس دَور میں ان کا شاعرانہ بنوغ زیادہ ظاہر نہ ہوا تھا تاہم عالمی حوالے سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں انھوں نے بعض اساسی نظریات پیش کیے جو بعد میں نثر و نظم اقبال میں ارتقا پذیر ہوتے رہے۔ اس دوران اقبال کا ایک اردو مقالہ، ایک انگریزی مقالہ اور ایک خطبہ شائع ہوا نیز ایک سو پچیس موضوعات پر اُن کا ایک انگریزی یادداشت نامہ بھی تیار ہوا۔ ترتیب اس طرح ہوگی:

۱۔ قومی زندگی ۱۹۰۴ء

۲۔ اسلام کی سیاسی فکر، لندن ۱۹۰۸ء مجلہ سوشیالوجیکل ریویو۔

۳۔ اسلام بطور ایک اخلاقی اور سیاسی تصور کے، ہندوستان ریویو الہ آباد۔ جولائی و اگست ۱۹۰۹ء۔ اس مجلے نے اقبال کا مذکور بالا مقالہ دوبارہ شائع کیا۔ یعنی ایک بار دسمبر ۱۹۱۰ء میں اور دوسری بار جنوری ۱۹۱۱ء میں۔

۴۔ ملّت بیضا پر ایک عمرانی نظر ۱۹۱۰ء : انگریزی عنوان بھی اس نوعیت کا تھا۔

۵۔ شذراتِ فکرِ اقبال (ڈائری) ۱۹۱۰ء : ہندوستان میں اِس کے ترجمے کا عنوان 'بکھرے خیالات' ہے۔

ان پانچ تحریروں کو اقبال کے اشعار کی روشنی میں دیکھیں تو بے حد معنی خیز ہیں۔

'قومی زندگی' کے عنوان سے حضرتِ علّامہ نے اپنا مقالہ ۱۹۰۴ء میں ایبٹ آباد کے ایک علمی حلقے میں[1] پڑھا تھا جو اسی سال مجلّہ "مخزن" میں شائع ہوا[2]۔ اس وقت حضرتِ علّامہ صرف ۲۶ سال

کے تھے۔ بلکہ ابھی تک فلسفہ قانون کی اعلیٰ تر تعلیم کے لیے یورپ بھی نہ گئے تھے۔ بااین ہمہ یہ جامع مقولہ اُن کے تفکر و دردمندی کا مظہر ہے۔ بقول سعدیؒ

بالائے سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی[3]

ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، اصل میں حضرتِ علامہ کا ایک انگریزی خطبہ ہے جو انہوں نے ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اہم خطبے کے اقتباسات ۱۹۱۱ء کی کل ہند مردم شماری[4] کی رپورٹ میں بھی نقل ہوئے۔ اردو ترجمہ[5] مولانا ظفر علی خان نے کیا جو ایک الگ کتابچے کی صورت میں شائع ہوا[6]۔ انگریزی متن اقبال میوزیم میں موجود ہے بلکہ ۱۹۳۵ء میں حضرتِ علامہ کی اضافی وضاحتوں کے ساتھ دوبارہ شائع بھی ہو چکا ہے[7]۔ یہ اور دوسرے مقالے افکارِ اقبال کے تقریباً تمام بنیادی خواص کے حامل ہیں مگر ان کی شاعری کے دبدبہ اور طنطنہ نے بالعموم ان کی نثر کو دبائے رکھا ہے حالانکہ، جیسا کہ حضرتِ علامہ نے اپنے انگریزی خطبات کے تناظر میں خود فرمایا ہے[8]، ان کی شاعری کی طرح ان کی نثر بھی بے حد اہم ہے۔

ایک شاعر جب نثر نگار بھی ہو تو اس کے اشعار اور عبارتیں متقابل وضاحت پیش کرتی ہیں۔ علامہ اقبال کے ہاں بھی ایسے ہی ہے یعنی کبھی نثر شعر کی اور کبھی شعر نثر کی وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔

قومی زندگی

اس مضمون میں سب سے پہلی بحث تنازع للبقا یا بقائے اصلح کی ہے[9]۔

دوسری بحث ایثار کے بارے میں ہے جو کسی دین و مذہب کے پیرو ہی انجام دے سکتے ہیں۔

اُس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا سے غلامی کا انسداد سب سے پہلے دینِ اسلام نے کیا ہے۔ طبقۂ نسواں کے آزادی پرور حقوق بھی اسی زمرے میں بیان کیے گئے ہیں۔

چوتھی بحث تعلیم کی ہے یعنی تعلیمِ عامہ اور تعلیمِ نسواں جس میں مقاصدِ تعلیم نمایاں طور پر بیان ہوئے ہیں۔

پانچویں نمبر پر عروج و زوالِ اقوام پر بحث ہے۔

چھٹی بحث ملّاؤں کے فروعی اختلافات کی داستان پر مشتمل ہے۔

ساتویں بحث خودی اور بے خودی کی اصطلاحوں کے بغیر فرد و معاشرت کی رابطے کی ضرورت

پر ہے ۔

اقبال کے نزدیک خودکشی کی کوشش اس لیے جرم ہے کہ فرد کو معاشرے کی خاطر جینا چاہیئے۔ اقبال یہاں جاپان کی ترقی کے ذکر میں تعلیم عامہ کے علاوہ اصلاحِ تمدن کی بات کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے حوالے سے وہ تکمیلِ تمدن کے لیے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اقبال نے اگرچہ شیعہ اور سنی تفسیروں اور فقہوں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا لیکن علماء سے نزاع نہ کرنے کی خاطر وہ اجتہاد کی بات معتذرانہ انداز میں کرتے ہیں۔ البتہ اس صلح پسند مفکر کو بعد میں نام نہاد صوفیہ کے خلاف معرکۂ خودی لڑنا ہی پڑا۔ وہ انگریزی خطبات میں شامل اپنے ضبطِ اجتہاد کی تیاری کے لیے علماء سے مشورہ کرتے رہے مگر "ما علیہ و ما لہ" لکھنے والوں میں سے کسی کو بھی ایسا جامع و مانع فکر انگیز مقالہ پیش کرنے کی توفیق نہ ملی۔ حافظ نے کہا ہے:

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد   آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

بعض توضیحی گزارشات

مذکورہ بالا نکات پر چند توضیحی گزارشات:

۱۔ بقائے اصلح کے ضمن میں اقبال نے لکھا ہے:

واقعاتِ عالم کے مشاہدہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی کی مختلف صورتوں یعنی انسانوں حیوانوں، پودوں وغیرہ میں ایک قسم کی عالمگیر جنگ جاری رہتی ہے۔ گویا نظامِ فطرت کا راز کارزارِ زندگی کا ایک دردناک نظارہ ہے جس میں ہر طبقۂ حیات اپنے ہمسایہ طبقوں سے برسرِ پیکار رہے اور اس کشمکشِ حیات میں بقائے اصلح کے اصول کے تحت معروفِ جد و جہد رہتا ہے۔

صدہا اقسام کے عجیب و غریب چوپائے اور پرندے کبھی روئے زمین پر اور سمندروں میں موجود تھے مگر اب ان کا نام و نشان نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوں جوں زندگی کے حالات اور اس کی شرائط تبدیل ہوتی گئیں، یہ حیوان فنا ہوتے گئے کیونکہ یہ اس انقلاب کے مختلف مراحل میں حالات کے ساتھ موافقت پیدا نہ کر سکے۔ یہ قانون جس کو حکمائے حال نے کمال صفت سے دریافت کیا ہے، ایک عالمگیر قانون ہے۔ انسان، حیوان، چرند، پرند، درخت، غرض زندگی کی کوئی ایسی صورت نہیں جو اس کے اثر سے

آزاد ہو لیکن میں اس وقت یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس زبردست قانون نے طبقہ انسانی کے نشوونما اور اس کے نوعی ارتقاء پر کیا عمل کیا ہے اور کر رہا ہے۔ کیا موجودہ انسان ابتدا سے ہی ایسا تھا جیسا کہ اب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نوع انسان کی موجودہ نسل ان زبردست قوی تہذیبوں اور تمدنوں کی یادگار ہے جو زندہ رہنے کی کوشش میں فنا کا شکار ہوئیں اور فنا بھی اس طرح ہوئیں کہ اس وقت ان کا نام ونشان تک بھی صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہے۔

اہرام مصری کے بانی ہزارہا سال ہوئے کہ مٹ گئے۔ یونان کے اشراقیین اور مشائیین کے فلسفے رہ گئے لیکن قوم کا نام ونشان تک دنیا میں نہیں ہے۔ افریقہ کی وہ زبردست قوم جس کے دلیر فوجی افسروں نے ممالکِ مغرب کو پامال کر کے اہل روما کی عظیم الشان سلطنت پر حملے کیے تھے، اب کہاں ہیں؟

کیا اس قوم کی کوئی یادگار باقی ہے؟ صدہا قومیں پیدا ہوئیں، پھلیں پھولیں لیکن آخر کار اس اٹل قانون کے عمل سے متاثر ہو کر خاک میں مل گئیں۔

نوع انسان کی موجودہ ترقی جیسا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کوئی سستے داموں نہیں ملی بلکہ سینکڑوں قومیں علمی اور تمدنی ترقی کی حسین دیوی کے لیے قربان ہوئیں اور ہزاروں افراد کا خون اس کی خوفناک قربان گاہ پر بہایا گیا۔ جنگیں، وبائیں اور قحط اس ہمہ گیر قانون کے عمل کی عام صورتیں ہیں اور اگر ان کو ارتقائے نوع انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ واقعات جو بظاہر آفاتِ سماوی معلوم ہوتے ہیں، طبقہ انسانی کے لیے ایک برکت ہیں جس کا وجود نظامِ قدرت کی آراستگی کے لیے بے انتہا ضروری ہے۔

اس قانون کا اثر اقوامِ انسانی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بزمِ ہستی کے کسی حصے کی طرف نگاہ کریں، اس کا عمل جاری نظر آئے گا۔ سینکڑوں مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے۔ بڑھے، پھولے پھلے اور آخر کار مٹ گئے، کیوں؟

اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کے عقلی ارتقاء کے ساتھ ساتھ نئی نئی ضروریات پیدا ہوئیں جن کو ان مذاہب کے اصول پورا نہ کر سکے لہٰذا نئے نئے علم کلام ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی، جن کے اصول کی رو سے انہوں نے اپنے اپنے مذاہب کو پرکھا اور ان کی تعلیم کو ایسی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی، جو علمی اور روحانی زندگی میں انسان کی راہنمائی کر سکے۔

اس حصے کا خلاصہ مثنوی اسرارِ خودی (اشاعت اوّل ۱۹۱۵ء) کے پہلے ہی عنوان میں

خودی کے ذکر کے ساتھ بزبانِ شعر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیر او پیداست از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است — خویشتن را غیر خود پنداشت است
سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذتِ پیکار را
میکشد از قوّتِ بازوئے خویش — تا شود آگاہ از نیروئے خویش
خود فریبی ہائے او عینِ حیات — ہمچو گل از خون وضو عینِ حیات
بہر یک گل خونِ صد گلشن کند — از پئے یک نغمہ صد شیون کند
یک فلک را صد ہلال آوردہ است — بہر صفے صد مقال آوردہ است
عذرِ این اسراف و این سنگیں دلی — خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی
حسنِ شیریں عذر دردِ کوہ کن — نافۂ عذرِ صد آہوئے ختن
سوزِ پیہم قسمتِ پروانہ ہا — شمع عذرِ محنت پروانہ ہا
خامۂ او نقشِ صد امروز بست — تا بیارد صبحِ فردائے بدست
شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت — تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است — پس بقدرِ استواری زندگی است
قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند — ہستیِ بے مایہ را گوہر کند
بادہ از ضعفِ خودی بے پیکر است — پیکرش منّت پذیرِ ساغر است
گرچہ پیکر می پذیرد جامِ مے — گردش از ما وام گیرد جامِ مے
کوہ چوں از خود رود صحرا شود — شکوہ سنجِ جوششِ دریا شود
موج تا موج است در آغوشِ بحر — می کند خود را سوارِ دوشِ بحر
چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست — می کشاید قلزمے از جوئے زیست[11]

۲۔ ایثار اور ظرف کی تعلیم کا عقیدۂ آخرت اور اساسیاتِ دین سے مستفاد ہونا ایک بدیہی بات ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملی معاشرے میں اس صفت کا مکمل طور پر فقدان ہے۔ حضرتِ علامہ کی تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جسے گذشتہ اقتباس کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے:

"..... یہ مصافِ ہستی نوعِ انسان کی ترقی کے لیے ضروری ہے اور یہ لہٰذا صرف

اس صورت میں بار آور ہو سکتا ہے کہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے پودے اس کے نمو کی خاطر باد سموم کی نذر ہو جائیں جس طرح نوع انسان کی مجموعی ترقی کے لیے مختلف اقوام کا نیست و نابود ہونا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ کسی قوم کے ارتقاء کے لیے کئی افراد نذر اجل ہو جائیں یا قوم کی نشو و نما کی خاطر ان کے ذاتی حقوق کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ لیکن یہاں ایک عجیب اور مشکل سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جس صورت میں کسی خاص فرد کو قوم کی آئندہ نسلوں کی بہبودی، ان کی عظمت و جلال اور ان کی عقلی و تمدنی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تو کیوں اس کے ذاتی حقوق پر قومی ارتقاء کو ترجیح دی جائے؟ کیا میں آج سے سو سال بعد زندہ رہوں گا؟ نہیں، پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو قوم کے لیے قربان کروں اور اپنی نیند حرام کر کے قوم کی آئندہ بہبودی کے لیے بے خواب راتیں بسر کروں؟ یہ بے چین کرنے والا سوال ہے جو کسی قوم کے افراد کے دلوں میں پیدا ہونا ممکن ہے اور جس کا کوئی عقلی جواب ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اس خطرناک شبہ کے وقت مذہب دست گیری کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایثار یعنی اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بناء عقل پر نہیں ہے بلکہ یہ نیکی جو ارتقاء نوع انسانی اور ترقی کے لیے سخت ضروری ہے، ایک فوق العادت اصول پر مبنی ہے۔"

آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اس کی حقیقی وقعت عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا دارومدار اس روحانی مشاہدے پر ہے جو نبی کے غیر معمولی قوا کو حاصل ہوتا ہے اور اس کی بنا پر اس کی آواز میں وہ ربانی سطوت و جبروت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سامنے انسانی شوکت ہیچ محض ہے۔

یہ ہے نمود مذہب کا اصلی راز جس کو منفی خیال کے لوگوں نے نہیں سمجھا اور جسے غلطی سے انہوں نے اصول مذہب کی خونریزیوں اور عالمگیر جنگوں کا محرک تصور کر لیا ہے۔ یہی حقیقت ہے قربانی کی جس کو تمام دنیا کی قوموں

نے وقتاً فوقتاً مختلف صورتوں میں اختیار کیا ہے۔ باریک بیں لوگ جانتے ہیں کہ اگر قبائل انسانی کو ایثار کی تعلیم نہ دی جاتی تو یقیناً ارتقائے انسانی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور موجودہ تہذیب و تمدن کی وہ صورت مطلق نہ ہوتی جو آج ہے۔ اگر ارتقائے تمدن و مذہب انسان کو ایک درخت سے تعبیر کیا جائے تو مذہب اس کا ایک پھل ہوگا اور پھل بھی ایسا پھل جس کا کھانا نوعی زندگی کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے پانی، ہوا اور غذا کا استعمال جسمانی صحت و بقا کے لیے لازم ہے۔"[12]

نبوت و رسالت کے حوالے سے ایثار و خدمت کا موثر بیان 'جاوید نامہ' کے فلک مریخ میں دیکھا جاسکتا ہے کہ البتہ اس ضمن میں اقبال نے دیگر مواردمیں بھی لکھا ہے۔

می شناسی طبع درّاک از کجاست؟ | جوئے اندر بنگۂ خاک از کجاست؟
قوتِ فکرِ حکیماں از کجاست؟ | طاقتِ ذکرِ کلیماں از کجاست؟
ایں دل و ایں وارداتِ از کیست؟ | ایں فنون و معجزاتِ او ز کیست؟
گرمیِ گفتار داری؟ از تو نیست | شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است | فطرت از پروردگارِ فطرت است
زندگانی چیست؟ کانِ گوہر است | تو امینی، صاحبِ او دیگر است
طبعِ روشن مردِ حق را آبروست | خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اوست
خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است | مزدِ خدمت خواستن سوداگری است
ہمچناں ایں باد و خاک و ابر و کشت | باغ و راغ و کاخ و کوئے سنگ و خشت
مُلکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ | تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ[13]

۳۔ اسلام اور انسدادِ غلامی یعنی اخوت، حریت (جمہوری نقطۂ نظر) اور مساوات کے سہ گانہ اصولوں کے مدنیت اسلام کی اساس ہونے کے بارے میں علامہ اقبال نے بہت لکھا البتہ اس ضمن میں اُن کا پہلا تاثر غالباً اسی مقالے میں ملتا ہے:

"..... اہلِ نظر جانتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں غلامی تمدنِ انسانی کا ایک ضروری جزو تصور کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ افلاطون جیسے فلسفی نے بھی اپنی کتاب "المملکت" میں اُسے جائز قرار دیا اور اس جواز کی ایک وجہ واضح ہے یعنی یہ کہ اس

زمانے میں کسی سے اُجرت پر کام کرا لینے کا خیال بھی انسانی ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ ملازمت ایک آزاد معاہدہ نہیں تصور کی جاسکتی تھی اور چونکہ نظامِ تمدن اصولِ ملازمت کے بغیر قائم رہ سکتا تھا اس واسطے غلامی کو جائز قرار دینا لازمی ہُوا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افرادِ انسانی کی ایک بہت بڑی تعداد بے جان اشیاء کی طرح ملکیت سمجھی جانے لگی اور آخر کار اُس آزاد جنگ سے خود بخود خارج ہو گئی، جو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری ہے۔

سب سے پہلے نبی عربؐ نے انسان کو فطری آزادی کی تعلیم دی اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دے کر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے۔ ایسا کرنا گویا نوعِ انسان کے ایک کثیر حصّے کو اس آزاد مقابلے کے میدان میں واپس لے آنا تھا جس کے اثر سے تمدن و تہذیب کی اعلیٰ صورتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو دنیا کی تمام تہذیب و شائستگی کی بیخ و بنیاد ہے۔

حکیم عربؐ کی اس مبارک تعلیم کا نتیجہ کیا ہوا؟ مسلمانوں میں غلام بادشاہ اور وزیر ہوئے، انہیں اعلیٰ تعلیم دی گئی بلکہ ان میں فلسفی اور ادیب پیدا ہوئے۔ غرض کہ اس قبیح امتیاز کے مٹ جانے سے ہر غلام ایک اعلیٰ خاندان کے آدمی کے ساتھ عقلی سطح پر مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس تعلیم کا سب سے اعلیٰ نمونہ جناب فاروقؓ نے پیش کیا جب کہ وہ بیت المقدس کی فتح کے لیے جا رہے تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا کی کسی قوم کی تاریخ ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی اور مسلمان اس تعلیم پر جس قدر ناز کریں بجا ہے[15]۔

اس کے علاوہ عورتوں کے حقوق کا نازک مسئلہ ہے جس کے متعلق حکیم عربؐ نے ایسی ہی آزادانہ تعلیم دی۔ اصلاحِ تمدن کے ضمن میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ حقوقِ نسواں کا ہے جس کے ساتھ چند اور ضروری مسائل، مثلاً تعددِ ازدواج[16]، پردہ، تعلیم وغیرہ وابستہ ہیں۔

مغربی علماء نے حقوقِ نسواں کے متعلق مذہبِ اسلام پر بعض بڑے بے جا

اعتراض کیے ہیں، لیکن یہ اعتراض حقیقت میں مذہبِ اسلام پر نہیں ہیں، جیسا کہ ان علماء نے خیال کیا ہے بلکہ ان کی آماجگاہ وہ استدلالات ہیں جو فقہائے اسلام نے کلام الٰہی کے وسیع اصولوں سے کیے ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ فردی اجتہادات مذہب کے کوئی ضروری اجزاء نہیں ہیں۔ ان تمام اعتراضات کا مقصد و مدعا یہی ہے کہ اصولِ مذہب اسلام کی رو سے عورتوں کی حیثیت محض غلامانہ ہے لیکن ذرا سوچیے کہ جس نبیؐ نے نوعِ انسانی کے ایک بہت بڑے گروہ یعنی غلاموں کو حقوق میں آقاؤں کے مساوی کر دیا، کس طرح ممکن تھا کہ وہی نبیؐ نوعِ انسانی کے ایک نہایت ضروری حصے کو جسے اس نے اپنی تین محبوب ترین اشیاء میں سے ایک کہا، غلاموں کی صورت میں منتقل کر دیتا۔

مسلمانوں کا موجودہ طریق عمل زیادہ تر فقہا نے قدیم کے ذاتی استدلالات پر مبنی ہے جو بلاشک و شبہ ترمیم طلب ہیں اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان استدلالات میں موجودہ حالات کی رو سے ترمیم کرنا گناہ ہے۔ بشرطیکہ یہ ترمیم اصولِ مذہب کے خلاف نہ ہو۔

عمومیات کو چھوڑ کر اگر خصوصیات پر نظر کی جائے تو عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں سارے تمدن کی جڑ ہے۔ "ماں" اور "بیوی" دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں۔ اگر ماں کی محبت میں حُبِ وطن اور حُبِ قوم پوشیدہ ہے، جس میں سے تمام تمدنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں، تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشقِ الٰہی کہتے ہیں۔

پس ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔

مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے لیکن اسی ضمن میں ایک غور طلب سوال

یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی عورتوں کو بھی مغربی عورتوں کی سی تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ان کے وہ شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں، قائم رہیں؟

۱۸ عورتوں کے حقوق کے ضمن میں پردے کا سوال بھی غور طلب ہے کیونکہ کچھ عرصے سے اس پر بڑی بحث ہو رہی ہے۔ بعض مسلمان جو مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہو گئے ہیں، اس دستور کے سخت مخالف ہیں اور اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اور حال کے دیگر اسلامی ممالک میں پردے کی یہ صورت نہیں تھی، جو آجکل ہندوستان میں ہے۔ مگر پردے پر زیادہ زور دیا جانا اخلاقی وجوہ پر مبنی تھا چونکہ اقوام ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی، اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لیے نہایت مضر ہوگا۔ ہاں اگر قوم کی اخلاقی حالت ایسی ہو جائے جیسی کہ ابتدائے زمانۂ اسلام میں تھی تو اس کے زور کو کم کیا جا سکتا ہے اور قوم کی عورتوں کو آزادی سے مردوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کی عام اجازت ہو سکتی ہے۔

ان تمام اصلاحوں کے علاوہ شادی کی بعض قبیح رسوم قوم کی توجہ کی محتاج ہیں نارضامندی کی شادیاں مسلمانوں میں عام ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے ۹۹ فیصد اسلامی گھروں میں اس بات کا رونا رہتا ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں نہیں بنتی۔ منگنی کا دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ شادی سے پہلے میاں بیوی کو اپنے بزرگوں کے سامنے گفتگو کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کی عادات اور مزاج کا مطالعہ کر سکیں اور ان کے مذاق قدرتاً مختلف واقع ہوئے ہیں تو منگنی کا معاہدہ فریقین کی خواہش سے ٹوٹ سکے لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق فانکحوا ما طاب لکم من النساء[19] پر پورا عمل نہیں ہو سکتا۔ . . . ."[20]

۲۱ یہ پورے یا جزوی خیالات اقبال کے بعد کے کئی مضامین میں عود کر آئے

جیسے خلافت اسلامیہ[21] (۱۹۰۸ء اصل میں انگریزی) اور اسلام بطور ایک اخلاق اور سیاسی تصور[22] کے (۱۹۰۹ء اصلاً انگریزی)۔ ان کی عبارات کے اقتباسات نقل کرنے سے اخذ و اقتباس کا توازن بڑھ جائے گا۔ البتہ مثنوی رموز بے خودی[23] کے اشعار اس ضمن میں پیش کیے جانے چاہئیں کہ ان کا موضوع بھی یہی ہے:

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت باج بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ
تا امینے حق بحقداراں سپرد بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر گشاد کوہ کن را پایۂ پرویز داد
اعتبارِ کار بنداں را فزود خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید بندہ را باز از خداونداں خرید
زادنِ او مرگِ دنیائے کہن مرگِ آتش خانہ و دیر و شمن
حریت زاد از ضمیرِ پاکِ او ایں مے نوشیں چکید از تاکِ او
عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است چشم در آغوشِ او وا کردہ است
نقشِ نو بر صفحۂ ہستی کشید امتے گیتی کشائے آفرید
امتے از ماسوا بیگانۂ بر چراغِ مصطفیٰؐ پروانۂ

امتے از گرمیِ حق سینہ تاب ذرہ اش شمعِ حریمِ آفتاب
کائنات از کیفِ او رنگیں شدہ کعبہ ہا بت خانہ ہائے چیں شدہ
مرسلان و انبیاء آبائے او 'اکرم' او نزدِ حق 'اتقائے' او[24]
'کلّ مومن اخوۃ' اندر دلش[25] حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ

ہمچو سرو آزاد فرزندانِ او [۲۶] پختہ از "قالوا بلیٰ" پیمانِ او
سجدۂ حق گل بسیما لیش زدہ ماہ و انجم بوسہ بر پالیش زدہ

۴۔ بعد میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں حضرت علامہ نے نثر اور نظم دونوں میں اس بات کا اضافہ کیا کہ اس تعلیم سے زن کا زن رہنا ضروری ہے اور اس کا نازن بن جانا نوعِ انسانی کی ناعاقبت اندیشی ہوگی۔

ازدواجی زندگیوں کی بے قاعدگیوں کی اصلاح اور عورتوں کے حقوق کا دفاع ہمیں اقبال کے ان مقدمات میں بھی ملتا ہے جو چیف کورٹ لاہور میں وہ لیتے رہے ہیں۔[۲۷] ۱۹۲۹ء میں جب حضرت علامہ جنوبی ہند تشریف لے گئے وہاں کی مسلمان عورتوں نے ان سے خاص طور پر اپیل[۲۸] کی تھی کہ وہ اپنے دل و دماغ سے ان کو بھی مستفید کریں۔ اس دعوت کو انھوں نے شرفِ پذیرائی بخشا جس کا ثبوت ضربِ کلیم کا باب "عورت" ہے۔ "قومی زندگی" میں مسلم معاشرے کے رسوم و رواج اور فضول خرچیوں کا بیان ہے۔ نیز صنعتی تعلیم کی ضرورت کا بھی ذکر ہے۔ یہی بیان ہمیں اقبال کی بعد از مرگ شائع ہونے والی کتاب 'ارمغانِ حجاز' میں بھی ملتا ہے[۲۹] 'پردے' کا بیان 'ضربِ کلیم' میں خودی کے حوالے سے ہے اور اس مضمون کی بات باندازِ دگر بیان ہوئی ہے:

بہت رنگ بدلے سپہرِ بریں نے
خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے، یہ خلوت نشیں ہے[۳۰]
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

اس حصے کے چند دوسرے اشعار کے اشارے بھی دیکھتے چلیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

All rights reserved ©2002-2006

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند؟

(آزادیٔ نسواں ضرب کلیم)

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

(عورت کی حفاظت ضرب کلیم)

مقامِ امومت کے بارے میں حضرت علامہ نے اردو اور فارسی میں بہت لکھا ہے۔ اپنی آخری تصنیف 'ارمغانِ حجاز' میں 'حضورِ ملت' کے باب میں وہ 'دخترانِ ملت' سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا — مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمالِ غازہ پرورد — بیاموز از نگہ غارت گری ہا
ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است — کشادش در نمودِ رنگ و آب است
جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز — کہ او با صد تجلی در حجاب است

(کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۹۴۷/۹۵)

رہی عورتوں کی نام نہاد تحریک 'بیزاری از مرداں' تو اس کے بارے میں حضرت علامہ کے اپنے بیانات کے علاوہ فلک مریخ کی نام نہاد مبلغہ زنیہ کی تقریر پر رومی کی زبانی تبصرہ ہی کافی ہے کہ:

مذہبِ عصرِ نو آئینے نگر — حاصلِ تہذیبِ لادینے نگر
زندگی را شرع و آئین است عشق — اصلِ تہذیب است دین، دین است عشق

ظاہر او سوز ناک و آتشیں باطنِ او نورِ ربّ العالمیں
از تب و تابِ درونش علم و فن از جنونِ ذوفنونش علم و فن
دیں نگردد پختہ بے آدابِ عشق دیں بگیر از صحبتِ اربابِ عشق [۳۱]

تعلیمِ عامہ کی خاطر اپنے بیان کی تائید میں اقبال نے نئے صنعتی ایشیائی ملک جاپان کی مثال دی ہے۔ جاپان نے تعلیمِ عامہ کے ذریعے افراد کی صلاحیتِ کار میں اضافہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ترقی یافتہ صنعتی ممالک سے بھی آگے نکل گیا۔

تعلیمِ عامہ کو لازمی کرنے کے لیے اقبال نے مقننۂ پنجاب میں بھی تقاریر کی تھیں۔ تعلیم کا مقصد اضافۂ صلاحیتِ خودی سے ہم آہنگ ہے اور اقبال اس کے مؤید تھے بلکہ ہنر و فن (صنعت) کو تعلیم کا جزو بنانے پر انھوں نے کئی جگہ اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ مثلاً ارمغانِ حجاز میں ہے:

بہ پورِ خویش دین و دانش آموز کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش [۳۲]
بدستِ او اگر دادی ہنر را ید بیضا است اندر آستینش

مضمون 'قومی زندگی' کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

۱۸۶۸ء میں جاپان کی پہلی تعلیمی مجلس قائم ہوئی۔ اس سے چار سال بعد یعنی ۱۸۷۲ء میں جاپان کا پہلا تعلیمی قانون شائع کیا گیا۔ شہنشاہ جاپان نے اس کی اشاعت کے موقع پر مندرجہ ذیل الفاظ کہے:

"ہمارا مدعا یہ ہے کہ اب سے ملک جاپان میں تعلیم اس قدر عام ہو کہ ہمارے جزیرے کے کسی گاؤں میں کوئی خاندان جاہل نہ رہے۔"

غرض کہ ۳۶ سال کے قلیل عرصے میں مشرقِ اقصیٰ کی اس مستعد قوم نے جو مذہبی لحاظ سے ہندوستان کی شاگرد تھی [۳۳]، دینوی اعتبار سے ممالکِ مغرب کی تقلید کی اور ترقی کر کے وہ جوہر دکھائے کہ آج دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور محققینِ مغرب اس کی رفتارِ ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔

جاپان کی باریک بین نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو دیکھ لیا اور وہ راہ اختیار کی جو ان کی قومی بقاء کے لیے ضروری تھی۔ افراد کے دل و دماغ دفعتاً بدل گئے اور تعلیم و اصلاح تمدن نے قوم کی قوم کو اور سے کچھ اور بنا دیا اور چونکہ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے رموزِ حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے۔ اس واسطے یہ ملک دینوی اعتبار سے ہمارے لیے سب

سے اچھا نمونہ ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ اس قوم کے فوری تغیر کے اسباب پر غور کریں اور جہاں تک ہمارے ملکی حالات کی رو سے ممکن و مناسب ہو اس جزیرے کی تقلید سے فائدہ اٹھائیں۔۔۔۔"

ان واقعات کی روشنی میں اگر ہندوستان کی حالت کو دیکھا جائے تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے[۳۴]۔ اقبال اضافہ فرماتے ہیں:

"کہ خام مال پیدا کرنے والے غیر صنعتی ممالک کبھی خوشحال نہیں ہو سکتے۔ جب مصنوعات اور تجارت کی طرف سے ہمارا ملک غافل ہو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ مصائب زندگی میں جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، کامیاب ہوں گے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے ملک سے کپاس، چائے، کوئلہ اور مصالح خام کی اور صورتیں ممالکِ غیر کو جاتی ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بدقسمت ہے وہ ملک جو ممالکِ غیر کے لیے مصالح خام کا ایک ذخیرہ ہو اور مصنوعات کے لیے ان کا محتاج ہو۔ وہ ملک جس کا دارومدار محض زراعت پر ہو جیسا کہ ہندوستان کا ہے، ترقی کی دوڑ میں کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ قحطوں اور وباؤں سے نجات پا سکتا ہے جب تک کہ وہ اپنی آبادی کی ضروریات پورا کرنے کی کوئی اور راہ نہ اختیار کرے۔

جب تک ہندوستان صنعتی ملک نہ ہوگا اور ہم جاپانیوں کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہوں گے اس وقت تک قدرت ہمیں قحط کے تازیانے لگاتی رہے گی، طرح طرح کی وبائیں ہمیں ستاتی رہیں گی، جس سے ہم جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ناتواں ہوتے جائیں گے۔

اقوامِ ہند میں سے ہمارے بھائیوں نے اس راز کو کسی قدر سمجھا ہے اور چونکہ یہ لوگ بالطبع اس کام کے لیے موزوں بھی ہیں اس واسطے یقیناً ان کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح

ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے ۔ ۔ ۔ ۔" ۳۵

بزبانِ شعر اس ضمن میں اقبال کا پر سوز بیان مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

خود بدانی بادشاہی قاہری است — قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج — از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است — بر زبانش خیر و اندر دل شر است
گر تو میدانی حسابش را درست — از حریرش نرم تر کرپاس تست
بے نیاز از کارگاہِ او گذر — در زمستان پوستینِ او مخر
صد گرہ افگندۂ در کارِ خویش — از قماشِ او مکن دستارِ خویش
ہوشمندے از خُمِ او مے نخورد — ہر کہ خورد اندر ہمیں مے خانہ مُرد
وقتِ سودا خند خند و کم خروش — ما چو طفلانیم و او شکر فروش
محرم از تاب و نگاہِ مشتری است — یارب ایں سحر است یا سوداگری است
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود — ما خریداراں ہمہ کور و کبود
آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر — آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند — خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند
اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر — چرب دستی ہائے یورپ را نگر
قالی از ابریشمِ تو ساختند — باز او را پیشِ تو انداختند ۳۶
وائے آں دریا کہ موجش کم تپید — گوہرِ خود را ز غواصاں خرید

جیسا کہ اشارہ کیا گیا تعلیم کا ایک مقصد صلاحیتِ کار میں اضافہ کرنا ہے حضرت علامہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں نے بالعموم یہ سمجھا ہے کہ تعلیم کا منشاء و مقصد زیادہ تر دماغی تربیت ہے اور جو تعلیمی کام آج تک ہمارے اہل الرائے نے کیا ہے۔ اس کی بنا پر اسی خیال پر رہی ہے مگر اس نے جہاں تک اس مسئلہ پر غور و فکر کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایک ایسی قابلیت کا پیدا کرنا ہے جس سے ان میں باحسنِ وجوہ اپنے تمدنی فرائض کے ادا کرنے کی صلاحیت

Iqbal Cyber Library
All rights reserved

پیدا ہو جائے ۔ میری مراد یہ نہیں کہ جو دماغ قدرتی طور پر علمی تحقیقات کی اصلی صورتوں کی طرف میلان رکھتے ہیں ان کے نمو کو روک دیا جائے ۔ بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ مجموعی حیثیت میں قومی تعلیم کی بنیاد ان ضرورتوں پر ہونی چاہیئے جو انقلابِ حالات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہوں ۔ انگلستان ایک تجارتی قوم ہے ۔ نپولین ہمیشہ اس قوم کو دکانداروں کی قوم کہا کرتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ تاریخی لحاظ سے یہ بات نپولین کے زمانے میں اس قدر صحیح نہ تھی جس قدر کہ اب ہے ۔ یہ ملک اپنی خوراک کے چار حصے اور قریباً قریباً تمام مصالحِ خام غیر ممالک سے حاصل کرتا ہے اور ہر دو صورتوں میں قیمت کے عوض غیر ممالک کو اپنی مصنوعات دیتا ہے ۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ انگلستان ایک بہت بڑی دکان ہے جس سے تمام دنیا کی قومیں اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتی ہیں ۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ انگلستان کو زیادہ تر ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو تجارتی کاروبار کو سرانجام دے سکیں ۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایسے ملک میں تعلیم کا مدعا زیادہ تر تجارتی قابلیت پیدا کرتا ہے اور اگر واقعات کی رو سے دیکھا جائے تو انگلستان نے اپنی قومی تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے ۔ اس وقت قومی زندگی کی شرائط میں جو حیرت ناک انقلاب آیا ہے ، میری رائے میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت و تجارت ہے ۔ ایشیائی قوموں میں سے جاپانیوں نے سب سے پہلے اس تغیر کے مفہوم کو سمجھا اور اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینے میں ایسی سرگرمی سے مصروف ہوئے کہ آج یہ لوگ دنیا کی مہذب اقوام میں شمار ہوتے ہیں ۔ اس امتیاز کی وجہ یہ نہیں کہ جاپانیوں میں بڑے بڑے فلسفی یا شاعر و ادیب پیدا ہوئے ہیں ، بلکہ جاپان کی عظمت کا تمام دارومدار جاپانی صنعت پر ہے ۔ ۔ ۔ "

حضرت علامہ کے یہ ارشادات آج بھی توجہ طلب ہونے ضروری ہیں ۔ اسرارِ خودی میں اسی عملیت کا رنگ نمایاں گویا آرزو ہے :

زندگی سرمایہ دار از آرزوست — عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست
چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم — چیست رازِ تازگیہائے علوم
آرزوئے کو بزورِ خود شکست — سر ز دل بیروں زد و صورت ببست
دست و دندان و دماغ و چشم و گوش — فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت — بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت
آگہی از علم و فن مقصود نیست — غنچہ و گل از چمن مقصود نیست
علم از سامانِ حفظِ زندگی است — علم از اسبابِ تقویمِ خودی است
علم و فن از پیشِ خیزانِ حیات — علم و فن از خانہ زادانِ حیات[۳۷]
اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز — از شرابِ مقصدے مستانہ خیز

۵۔ پانچویں بحث میں اقبالؔ یہودیوں کی دولت مندی کا ذکر کرتے ہیں۔ ضمنی طور پر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلا مقنّن اور توحید مطلق کا استاد قرار دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا بھی ذکر ہے مگر جو صحیفے کتاب تورات کی صورت میں حضرت موسیٰؑ کو ملے وہ یہودیوں کے ہاتھوں تحریف شدہ ہونے کے باوجود اس بات کے غماز ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنی قوم بنی اسرائیل کے لیے اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق مکمل معاشرتی قوانین ملے تھے چنانچہ قرآن مجید بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں، ان کے جداگانہ چشموں، ان کی معاشرت اور ان کے سفر و حضر کے بارے میں اشارے کرتا ہے۔

اقبالؔ مشہور یہودی فلسفی اسپینیوزا کے مسئلۂ وحدت وجود سے دلچسپی کا ذکر کرتے ہیں۔[۳۸]

افغانیوں کے بارے میں بڑی حد تک لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ بنی اسرائیل ہی کی ایک شاخ ہیں۔ ضمناً وہ لکھتے ہیں کہ مسئلۂ وحدت وجود 'آلِ یافث' کی مشرقی شاخ یعنی ہندوؤں میں بہت ترقی یافتہ تھا مگر اسپینیوزا پر وحدانیت کے فلسفے کا مطلق اثر نہیں ہے۔[۳۹]

اقبالؔ افغانستان کی چھوٹی سی کوہستانی افغانی ریاست کا ذکر کرنے کے باوجود یہودیوں کا حال پارسیوں جیسا بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دولت کے بل بوتے پر یہ قومیں دنیا

بھر میں تتر بتر ہو کر بھی اپنا اثر رکھتی ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صنعت و تجارت کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔

اس مضمون کے کوئی چودہ برس بعد جب مثنوی "رموزِ بے خودی" شائع ہوئی تو اس میں اقبال نے یہودیوں کی اپنی قومی روایات اور تہذیب و تمدن سے وابستگی کو ان کے روشن مستقبل کی ایک دلیل قرار دیا اور ان کی یہ پیش گوئی معمولی نوعیت کی نہیں ہے۔ اقبال ۱۹۰۴ء میں یہودیوں کے اس ایثار کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا کی سرزمین کو دولت کے بل بوتے پر خرید رہے ہیں۔

مثنوی مذکور میں ہے:

عبرت از احوالِ اسرائیل گیر   حکمت دارد اگر جانِ بصیر
سختیٔ جانِ نزارِ او نگر   گرم و سردِ روزگارِ او نگر
سنگِ صد معلیز و یک سیمائے او   خون گراں سیر است در رگ ہائے او
یادگارِ موسیٰ و ہارون نمرد   پنجۂ گردوں چو انگورش فشرد
لیکن اندر سینہ دم دارد ہنوز   از نوائے آتشینش رفت سوز
جز براہِ رفتگاں محمل نبست   زانکہ چون جمعیتش از ہم شکست

۱۹۰۵ء میں انگلستان جاتے ہوئے اقبال نے اپنے سفر کی جو روداد اخبار "وطن" کو بھیجی اس میں زرتشتیوں یا پارسیوں کا ذکر یکساں نوعیت کا ہے مگر سفر نامے میں اقبال اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کوئی قوم کتنی ہی دولت مند کیوں نہ ہو، کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ مضمون "قومی زندگی" میں بھی وہ یہودیوں اور پارسیوں کی تجارت سے وابستگی کا ذکر کرتے ہیں:

"۔۔۔۔ پارسیوں ۔۔۔۔۔۔ کی صلاحیت نہایت قابلِ تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ مگر اس قوم کے پیسے کسی اچھے فیوچر (Future) کی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی سطح پر اقتصادی پہلو کے سوا اور کسی پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرّہ یہ کہ فارسی کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

Iqbal Cyber Library All rights reserved ©2002-2006

یہ حصہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہوئے فرہنگی زبانوں جیسے فارسی اور ادب و ثقافت کی ضرورت کی نفی کر دیتے ہیں حالانکہ "قومی زندگی" کے لیے سب چیزوں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

ایک متفکر مضمون نگار کی تمنیات، خاص طور پر قابلِ ذکر ہوتی ہیں۔ یہاں اقبال نے نبوت کی شرط و معجزہ کی طرف اشارہ کیا جو ان کے نزدیک یہ ہے کہ ایک منظم اُمت پیدا کی جائے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" میں فلک قمر پر شانِ نبوت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ ان کے مضمون "قومی زندگی" میں اس طرح آیا ہے:

"آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اس کی حقیقی وقعت عقلی دلائل براہین پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا دارومدار اس روحانی مشاہدے پر ہے جو نبی کے غیر معمولی قواء کو حاصل ہوتا ہے اور جس کی بنا پر اس کی آواز میں وہ ربانی سطوت و جبروت پیدا ہو جاتا ہے جس کے سامنے انسان کی شوکت ہیچ محض ہے۔ یہ ہے نمودِ مذہب کا اصل راز جس کو سطحی خیال کے لوگوں نے نہیں سمجھا اور اسے غلطی سے انھوں نے اصولِ مذہب کی خونریزیوں اور مالی جنگوں کا محرک تصور کیا ہے۔ . . . . . ." (الخ)[۱۴]

جاوید نامہ میں ہے:

سوز و مستی نقشبندِ عالمے است — شاعری بے سوز و مستی ماتمے است
شعر را مقصود اگر آدم گری است — شاعری هم وارثِ پیغمبری است
گفتم از پیغمبری هم باز گوے — سرِّ او با مردِ محرم باز گوے
گفت "اقوام و ملل آیاتِ اوست — عصر ہائے ما ز مخلوقاتِ اوست
از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت — ما ہمہ مانندِ حاصل، او چو کشت
پاک سازد استخوان و ریشہ را — بالِ جبریلے دہد اندیشہ را
حاے و ھوے اندرونِ کائنات — از لبِ او نجم و نور و نازعات
آفتابش را زوالے نیست نیست — منکرِ او را کمالے نیست نیست
رحمتِ حق صحبتِ ابرارِ او — قہرِ یزداں ضربتِ کرارِ او
گرچہ باشی عقلِ کل از وے مرم — زانکہ او بیند تن و جاں را بہم[۱۵]

فرد اور معاشرے کا رابطہ یعنی خودی اور بے خودی یہاں بھی بڑی وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ اقبالؔ فرد کی خدمت قوم کو عبادت بتاتے ہیں اور اوپر اشعار نقل ہو چکے ہیں کہ :

طبعِ روشن مردِ حق را آبروست — خدمتِ خلقِ خدا مقصود اوست
خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است — مزدِ خدمت خواستن سوداگری است

مگر یہ بیان زیادہ وضاحت کے ساتھ اقبالؔ کی معاشرتی تعلیمات کی حامل کتاب مثنوی رموزِ بیخودی کے آغاز میں "در معنی ربط فرد و ملّت" کے عنوان کے تحت آیا ہے :

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ او را کمال از ملّت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش

ملّاؤں کے اختلافات اور مسلمانوں کے غلط رسم و رواج پر انتقادات بھی اس مضمون میں بڑے دلچسپ انداز میں ملتے ہیں۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے اقبالؔ بہت پہلے اپنے مضمون میں ضرورتِ اجتہاد پر زور دیتے ہیں۔ وہ حنفی اور شیعی فقہوں سے اپنی عمیق آگاہی کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن کم عمر ہونے کی وجہ سے اجتہاد کی بات معذرت کے انداز میں کرتے ہیں اور رموزِ بیخودی میں وہ عصرِ زوال میں ہونے کی وجہ سے اجتہاد میں احتیاط برتنے کی تلقین کرتے ہیں :

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر — اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست — کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں رابسد ہمے باریک تر — ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر[۴۳]

لیکن آخر کار ۱۹۲۹ء میں علماء سے مشوروں کے بعد اپنا خطبۂ اجتہاد انہوں نے ارشاد کر ہی دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفی اقبالؔ سے یہ متکلمانہ خطبہ سامعین نے کچھ بے حسی سے سنا تھا مگر یہ بیسویں صدی کی ایک نہایت بے باک اور معنی خیز صدا تھی اور ہے۔ ۱۹۰۴ء سے آغاز پذیر یہ موضوع شعرِ اقبالؔ میں بھی کئی موارد میں آیا ہے۔ مثلاً جاوید نامے کا فلک عطارد ہی دیکھیں :

---

(۱)

زندہ دل خلاقِ اعصار و دھور   جانش از تقلید گردد بے حضور
چوں مسلماناں اگر داری جگر   در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست   عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر رابس است   گیر اگر درسینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست   ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش   می دھد قرآں جہانے دیگرش

(۲)

از حدیثِ مصطفیٰ[۲] داری نصیب   دینِ حق اندر جہاں آمد غریب
با تو گویم معنیٔ ایں حرف بکر   غربتِ دیں نیست فقرِ اھلِ ذکر
بہر آں مردے کہ صاحب جستجواست   غربتِ دیں ندرتِ آیاتِ اوست
غربتِ دیں ھر زماں نوعِ دگر   نکتہ را دریاب اگر داری نظر
دل بآیاتِ مبیں دیگر بہ بند   تا بگیری عصرِ نو را در کمند

(۳)

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست   نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ھم پیداست ایں   زندہ و پایندہ و گویاست ایں
اندرو تقدیر ہائے غرب و شرق   سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق
با مسلماں گفت جاں برکف بنہ   ھر چہ از حاجت فزوں داری بدہ
آفریدی شرع و آئینے دگر   اندکے با نورِ قرآنش نگر
از بم و زیرِ حیات آگہ شوی   ھم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی ۳۳م الف

(کلیات اقبال، فارسی ص ۶۵۸، ۶۶۵/۶۶۶، ۶۶۹)

زندہ دل زمانوں کو وجود میں لے آتا ہے۔ زندہ دل والا شخص تقلید سے روگرداں رہتا ہے۔ تجھے مومنوں کا سا جگر میسر ہو تو اپنے ضمیر اور قرآن مجید کو دیکھو۔ قرآن کی آیات

میں سینکڑوں جہان مضمر ہیں اور اس کے لمحوں میں زمانے پیتے ہوئے ہیں زمانۂ حاضر کے لیے ایک دنیا کافی ہے۔ دل حقائق رس ہو تو اسے لے لو۔ مومن انسان اللہ کی آیات و نشانیوں میں سے ہے۔ ہر جہان اس کے لیے لباس کی طرح ہے۔ اس کے جسم پر جہاں پرانا ہونے لگے تو قرآن حکیم اسے نئی دنیا دے دیتا ہے۔ . . . . . .

تجھے اس حدیثِ رسولؐ کی خبر ہے کہ :

'اسلام' دنیا میں 'غریب' (مسافر) بن کر آیا ہے۔

اس حرفِ تازہ کا مدعا یہ نہیں کہ مسلمان 'غریب و نادار' رہیں گے۔ محقق شخص کو خبر ہے کہ جدت و اجتہاد مراد ہے دل کو آیات الٰہی سے لگا تاکہ عصرِ نو کو قابو کر سکے۔

قرآن آیا تو کاہنوں اور پوپوں کے نقش باطل ہو گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کچھ اور ہی بات ہے۔ یہ روح کو بدل کے رکھ دیتا ہے اور پھر دنیا بدل جاتی ہے۔ خالقِ کُل کی طرح یہ کتاب ظاہر و پنہاں، زندہ و پائندہ اور ناطق ہے۔ اس میں شرق و غرب کی تقدیریں پنہاں ہیں۔ تو بجلی کی طرح برق رفتاری پیدا کر۔ اس کتاب نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ زائد از ضرورت مال خرچ کر لیا کریں (روس والو) تم نے نئی شرع بنائی۔ اسے نورِ قرآن سے دیکھو۔ اس طرح زندگی کے اونچ نیچ کی تجھے خبر ملے گی اور زندگی کی تقدیر سے تو آگاہِ حال بنا رہے گا۔

اسلام کے نظامہائے اخلاق و سیاست پر مقالے

ایک مضمون Political Thought in Islam اقبال نے قیامِ یورپ کے زمانے میں لکھا۔ اسے انہوں نے ایک محفل میں پڑھا بھی تھا۔ وہ لندن کے مجلّہ Socialogical Review کی اکتوبر ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں شامل تھا۔ مصنف کا نام S.M. Iqbal (شیخ محمد اقبال) مرقوم ہے۔

یہی مقالہ الہ آباد کے مجلّہ 'ہندوستان ریویو' میں دسمبر ۱۹۱۰ء اور جنوری ۱۹۱۱ء کی اشاعتوں میں دوبارہ شائع ہوا اور اس سے قبل 'ہندوستان ریویو' کے جولائی اور اگست کے شماروں میں اقبال کا ایک مبسوط مضمون Islam as a Moral and Political Ideal شائع ہو چکا تھا۔ گو یہ لندن سے شائع ہونے والے مقالے سے کیسر مختلف ہے وہ سوشیالوجیکل

ریویو، والے مقالے کا 'خلافت اسلامیہ' کے عنوان سے متداول ترجمہ چوہدری[26] محمد حسین کا ہے اور دوسرے مختصر متن کی کتاب کے حجم[27] کے مقالے کو ڈاکٹر حامد خان حامد مرحوم نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ترجمہ کیا ہے[28]۔ البتہ کتابچے کے مرتب نے Moral کو Ethical کے لفظ سے بجانے کیوں بدل دیا ہے۔

'خلافت اسلامیہ' ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں اقبال نے قبل از اسلام عربوں کی سیاسی اور معاشرتی حالت اور خلفائے راشدینؓ کے انتخاب سے بحث کی اور علم سیاست کی اہم کتابوں کے حوالے سے انہوں نے خلیفہ کے انتخاب، ان کی اہلیت اور معزولی کے بارے میں دلائل دیئے۔ اس کے علاوہ خلیفہ کے مرد یا عورت ہونے اور اس کی عمر کے بارے میں بھی دلائل ملتے ہیں۔ پھر نظامِ خلافت میں محدود دوں محدود اختیارات والے وزراء اور اعلیٰ عہدے داروں کے تقرر کا بیان ہے۔

اقبال نے یہاں الماتریدی، اشعری، محمد الغزالی اور البیضاوی جیسے اکابر مصنفین سیاست کے اقوال نقل کیے لیکن ان کے خیال میں حقیقی خلافت، خلافت اسلامیہ پر ختم ہو گئی۔ بعد میں منتخب یا نامزد ملوکیت کا دور دورہ رہا ہے۔ اس مضمون میں خلافت کے سلسلے میں سنی و شیعہ حضرات کی آراء کے علاوہ خارجیوں کا نقطۂ نظر بھی پیش کیا گیا ہے۔

علامہ کا مقام اسلام بطور ایک اخلاقی اور سیاسی تصور، مفصل اور مبسوط ہے۔ ابتدا میں اقبال کائنات کے حقیقی ہونے پر بحث کرتے ہیں۔ کائنات میں اچھے اور برے دونوں پہلو ملتے ہیں مگر انسان کا وظیفۂ حیات یہ ہے کہ نیکی کرے اور کائنات میں نیکیاں پھیلائے۔ قرآن مجید نیکی کا درس دیتا ہے اور اس کے پھیلانے کی ترغیب بھی۔

بدھ مت نے انسان کے مسلسل اذیت میں مبتلا رہنے کا جو تصور دیا یا عیسائیت جس طرح انسان کے بدی سے آلودہ ہونے پر مصر ہے، رہا زرتشتی مذہب تو وہ نور و ظلمت کی آویزش کے بیانات و عقائد پر مبنی ہے۔

اسلام ایسی کوئی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام گناہ اور غم کی موجودگی کا اعتراف کرتا ہے مگر وہ غیر معمولی رجائیت اور مایوسی میں کسی کو نہیں اپناتا بلکہ درد و غم اور مایوسی پر غلبہ پانے اور معاشرے کو سراپا نیکی بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسلام کائنات میں خوف و حزن کی موجودگی سے لوگوں کو ہراساں نہیں کرتا۔ وہ قوت اور شکوت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس دین میں دین و سیاست کی جدائی نہیں۔ یہ

دین عقاید، عبادات اور معاملات کے ذریعے نیکی کو فروغ دیتا ہے۔

اپنے مضمون 'قومی زندگی' میں اقبال نے یہ لکھا تھا کہ اسلام نے غلامی کا انسداد اور اس کا تدریجی خاتمہ کیا۔ اس دلپذیر موضوع پر وہ یہاں بھی کٹ کرتے ہیں اور افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس کا مدعا یہ ہے کہ اس امیر کو اپنے غلاموں پر بے حد اعتماد تھا اور اس نے انہیں نہایت اعلیٰ عہدے تفویض کر رکھے تھے۔

اپنے خطبہ پنجم 'اسلامی ثقافت کی روح' میں اقبال نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قدیم و جدید دنیا کے درمیان رابطہ قرار دیا ہے۔ اس خطبے میں یہ رابطہ سلسلۂ وحی اور جدید تفکر کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔

'قومی زندگی' میں حضرت عمرؓ کا ذکر ہے کہ وہ اور ان کا غلام ایک ہی سواری استعمال کرتے ہوئے بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے۔ اس مضمون میں خلیفہ ثانیؓ کا ذکر اس حوالے سے ہے کہ انہوں نے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر غلام اور محکوم بنائے جانے والے سب لوگوں کو آزاد قرار دے دیا تھا۔

غلامی کے سلسلے میں یہاں ایک نکتے کا اضافہ ملتا ہے اور وہ جناب رسول اللہؐ کے منہ بولے بیٹے زیدؓ کے بارے میں ہے جن کے عقد میں پیغمبرؐ کی پھوپھی زاد حضرت زینبؓ آئی تھیں اور جنہیں حضرت زیدؓ کی طلاق کے بعد خود پیغمبرؐ اسلام نے اپنے عقد میں لے لیا تھا اس سے متبنّیٰ کی حیثیت واضح ہوتی تھی کہ وہ حقیقی بیٹے کی طرح نہیں ہوتا اور اس سے غلامی کی حیثیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ (قرآن مجید سورہ ۳۳)

اقبال تعلیم کا بڑا مقصد کردار سازی بتاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی کہ نہ ان کے جسم مضبوط تھے اور نہ قوتِ ارادہ اور کردار ہی پختہ تھے۔ اس مقالے کے آخر میں کردار سازی کے سلسلے میں جو کچھ اقبال نے فرمایا ہے وہ گویا ان کا تصورِ خودی ہے جو بعد میں زیادہ آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔

وہ فرماتے ہیں کہ:

"ہندی مسلمان یورپ کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں مگر اپنے ماضی سے کٹ چکے ہیں۔"

اس مقالے میں اسلام کے اخلاقی پہلو پر زیادہ بات کی گئی ہے۔ اقبال نے بعد میں مثنوی

اسرارِ خودی[۴۹] میں بھی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اسلام صرف 'دفاع اور اصلاح' کی خاطر تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ بنیادی طور پر اسلام اپنے نام کے ہم معنی یعنی امن ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ فرد کی نشوونما کرتا ہے۔ اس کا تصور قومیت ایک خالص تصور ہے جس میں کوئی جغرافیائی حد نہیں اگرچہ وطنی تلمرو کی حدود سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر مسلمانوں کا مرکزی نقطہ مکہ مکرمہ[۵۰] ہے جہاں ان سب کی راہیں جا ملتی ہیں۔

جمہوریت اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ ہے بشرطیکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قابلِ عمل آزادی دی جائے۔ اسلام میں خلیفہ یا حاکم معصوم نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ خلیفہ یا حاکم معزول کیے جاتے رہے ہیں البتہ خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور کے بعد اموی عہد سے اسلامی دنیا بالعموم حریت اور جمہوریت سے محروم رہی۔

اقبال فرماتے ہیں کہ صرف حقِ انتخاب جمہوریت نہیں ہے کیونکہ یہ تو بعض قدیم حکومتوں میں بھی رائج رہا ہے۔ جمہوریت تو ایک طرزِ عمل کا نام ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام کے بنیادی امور یہ ہیں کہ خدائی قانون کو بالادستی حاصل ہو اور معاشرے کے تمام افراد قانونی مساوات سے بہرہ مند ہوں۔

یہاں اسلامی مساوات کے سلسلے میں اقبال نے عثمانی سلطان مراد سوم اور ایک معمار کے قصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ قصہ مثنوی رموزِ بیخودی میں[۵۱] مساوات کے سلسلے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس عثمانی سلطنت کی پرہیزگاری اور انصاف پرستی ہمیں پیامِ مشرق کے دیباچے میں بھی ملتی ہے۔ اس مضمون کا آخری پیراگراف فرقہ بندی کے خلاف اقبال کے جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اسلام کے پیروؤں نے ذات پات اور عدمِ مساوات میں ہندوؤں کو بھی پیچھے چھوڑ چکے ہیں کیونکہ ہندوؤں کی رسمیں تو انھوں نے اپنا رکھی ہیں اور کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی کر رکھا ہے وہ بڑی جرأت سے لکھتے ہیں کہ ہندو محکوم اپنی روایات کو رواج دے کر مسلمان حاکموں سے بدلہ لے رہے ہیں۔

یہاں اقبال نے مرزائیوں کا ذکر مسلمانوں کے زمرے میں کیا ہے اور جیسا کہ علی گڑھ میں ۱۹۱۵ء میں اُن کا خطبہ 'ملتِ بیضا' پر ایک عمرانی نظر منظہر ہے۔ دراصل ۱۹۱۱ء تک اس گروہ نے اپنے گمراہ کن عقاید اور غلیظ عزائم ظاہر نہیں کیے تھے اور جب یہ سب کچھ ظاہر ہو گیا تو اقبال اس

گروہ کے صفِ اوّل کے مخالفوں میں شامل ہو گئے۔

اقبال کے اس مضمون کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

"جب رات کی تاریکی میں چلا جائے تو پاؤں کے ٹھوکر کھانے کی شکایت کرنا حماقت ہے۔ آیئے اور تعمیرِ ملّت میں حصّہ لیجئے، ذات پات اور فرقہ بندی کے بتوں کو ہمیشہ کے لیے توڑ ڈالیے اور اس سرزمین کے مسلمانوں کو ایک عظیم قوت کے طور پر زیادہ متحد ہو جانا چاہیئے۔ جب ہم خود اندرونی خلفشار کا شکار ہوں تو ہم دوسروں سے یہ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ ہم انہیں اپنی طرف راغب کر سکیں گے۔

اسلام کا بطور ایک ملّت کے یہ فرض اور وظیفہ ہے کہ وہ عالمِ انسانی کو توہمات سے نجات دلائے اور اس سلسلے میں وہم اور افسانے کی سرزمین ہندوستان میں ہم نے بہت کم کام کیا ہے لیکن دوسروں کو آزادی دینے والے جب تک اپنے پاؤں کی بیڑیاں نہ کھولیں، وہ یہ کام کیسے انجام دے سکتے ہیں۔"

(ترجمہ)

یہ مضمون آج بھی توجہ کا طالب ہے۔ مذکورہ بالا باتیں اقبال کے اشعار میں بھی ملتی ہیں۔ ۱۹۱۱ء تک "تصویرِ درد" کا مضمون مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے الگ الگ راہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ بات ان کی بعض نظموں اور خطوں سے عیاں ہے مگر ابھی خودی اور بے خودی کی گلبانگ ان کے حواشیٔ خیال میں ہی گونج رہی تھی۔ اس دوران انھوں نے ڈائری لکھی اور علی گڑھ میں خطبہ دیا۔ ان تحریروں میں ملّتِ مسلمہ کی خصوصیات، فرد اور ملت کا رابطہ اور دیگر قومی موضوعات زیادہ واضح ہو گئے۔ ہم یہاں خطبہ علی گڑھ پر مختصر بحث کرتے ہیں اور ڈائری کے مطابق ضمناً آجائیں گے۔

ڈائری بظاہر ۱۹۱۰ء میں ہی آغاز پذیر ہوئی اور اسی سال ختم ہوئی۔ اس کے بعض حصّے مجلّہ "نیوایرا" میں شائع ہوئے۔ اس کے قومی اہمیت کے بعض عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

"اقسامِ حکومت، شخصیت کی بقا، تاریخ، عصبیت، وطن پرستی، ملّی اتحاد، حق اور طاقت، اورنگ زیب، تولیتِ اقوام، تعددِ ازدواج، دشمنوں سے نفرت، مسلمانانِ ہند کے لیے بحرانی دور، مساوات، تعلیم کی غایت،

قومیت کا تصور، ضبطِ نفس، مسلم قوم کی حیرت انگیز تاریخ، تفکر بغیر عمل، کامیاب انسان، جمہوریت اور سامراج، تجربہ اور علم، ادبی تنقید، مقصدِ واحد کی لگن . . . . ."

ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

جیسا کہ بیان ہوا ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۰ء کے دوران علامہ اقبال کی تین چار نہایت اہم نثری تحریریں شائع ہوئیں۔

ا۔ پولیٹکل تھاٹ ان اسلام (انگریزی) جسے چوہدری محمد حسین نے خلافتِ اسلامیہ، کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ مضمون ۱۹۰۸ء میں اور دوبارہ ۱۹۰۹ء - ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔

ب۔ اسلام ایک اخلاقی اور سیاسی تصور کے طور پر (انگریزی) ۱۹۰۹ء

ج۔ شذراتِ فکر (اسٹرے ریفلیکشنز،) (انگریزی) ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی۔

د۔ زیرِ تبصرہ خطبہ، جس کا انگریزی میں عنوان، مسلم کمیونٹی، اے سوشیالوجیکل اسٹڈی، ہے، ۱۹۱۰ء۔

مندرجہ بالا مقالات کی کئی عبارات مشترک ہیں اور کئی مطالب یکساں و ہم آہنگ۔ تاہم ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، کے اکثر مطالب 'قومی زندگی' کے مفاہیم کا تکملہ ہیں۔ اس لیے یہاں ہم اس کی بالاختصار توضیح پیش کرتے ہیں۔

ایک بحث فرد و معاشرے کے رابطے کی اور دوسری مسلم قومیت کی جداگانہ ہیئت ترکیبی کی ہے۔ تیسری بحث تعصّب اور عصبیت کے فرق کے بارے میں اور چوتھی اس بارے میں ہے کہ اسلام مسلمانوں کا نظامِ حیات ہے یعنی سیاست اور معاشرت کے جملہ پہلو اس زمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً فتح ایران کا تاریخِ اسلام کا اہم ترین واقعہ ہونا، اورنگ زیب عالمگیر کا برِّصغیر میں قومیت اسلامی کا بانی ہونا وغیرہ جن کا ذکر حضرت علامہ کی ڈائری میں بھی ہے اس کے علاوہ تعلیم عامہ اور تعلیم نسواں جس کا اجمالی بیان 'قومی زندگی' میں بھی ملتا ہے۔

قوم اگرچہ افراد ہی کا مجموعہ ہے تاہم مجتمع چیز کی قوت کا اور ہی عالم ہے۔ قوم بہرحال فرد سے جامع ہے اور قوم کی تقویت کو ہر حال میں مقدم جاننا چاہیئے۔ اشعارِ اقبال میں بھی یہ

موضوع اکثر بیان ہوا ہے اس لیے عبارت اور اشعار نقل کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ تعصب اور عصبیت کے فرق پر اقبال نے اپنے بعض مکتوبات میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈائری اور اس مضمون کے بیانات یکساں نوعیت کے ہیں۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ وطنیت کے سیاسی تصوّر کو برحق ماننے والی اقوام کو اپنے خطۂ وطن کی عصبیت لاحق ہے جبکہ مسلمانوں کے نزدیک دین مقدّم ہے۔ مسلمان اپنے دین کے خلاف سن کر ایسے برافروختہ ہوتے ہیں جیسے وطن پرست اپنے وطن کے خلاف بات سن کر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو یہ لوگ متعصب یا حبِّ وطن سے عاری ہونے کا طعنہ دینے لگتے ہیں جبکہ یہ باتیں غلط فہمی اور لاعلمی کی بنا پر ہیں:

"اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لیے نمودار ہوا تھا لیکن اس سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ میں جذبہ حبِّ وطن کا سرے سے مخالف ہوں۔ ان قوموں کے لیے جن کا اتحاد حدودِ ارضی پر مبنی ہو، اس جذبہ سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے لیکن میں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حبِّ وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے۔ ہم مسلمانوں کی عصبیت کو برا نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصب کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ہماری عصبیت ایسی ہی حق بجانب ہے جیسی ان کی وطن پرستی کی عصبیت سے بجز اس کے اور کچھ مراد نہیں کہ اصول حبِّ نفس بجائے اس کے کہ ایک فردِ واحد میں ساری دائر ہو ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے۔

حیوانات کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور ہوتی ہیں اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہو تو ضرور ہے کہ ان میں عصبیت موجود ہو۔ اقوامِ عالم پر نظر ڈالیے، ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجئے، وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا، اس لیے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں کیا، جو اس کی قومیت کی روح و رواں ہے لیکن ذرا اس کے تمدّن، اس کے ملک یا پولیٹیکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا اشعار پر

تو خردہ گیری کر دیکھئے۔ پھر اس کی جبلّی عصبیت کا شعلہ بھڑک نہ اٹھے تو ہم جانیں۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیت کا انحصار اس کے معتقداتِ مذہبی پر نہیں ہے بلکہ جغرافیائی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے۔ پس جب آپ اس خاص خطۂ زمین پر جسے اس نے اپنے تخیل میں اپنی قومیت کا اصل اصول قرار دے رکھا ہے، معترض ہوتے ہیں تو آپ اس کی عصبیت کو واجبی طور پر انگیختہ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک شئے فی الذہن ہے، وجود فی الخارج نہیں ہے۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آکر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشراقی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو برا کہنا ہماری ہوسِ آتشِ عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے، میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصّہ سے کچھ کم واجبی نہیں ہے جو اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اٹھتا ہے۔۔۔"

سیاسی عقیدۂ وطنیت کی مخالفت بھی[۵۳] اقبال کی تحریروں میں بار بار ملتی ہے۔ ہم یہاں چند اردو اور فارسی اشعار نقل کر رہے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی ہے روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ سیاست تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(وطنیت، یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے، بانگِ درا حصّہ سوم)

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیّت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

(مذہب، بانگِ درا حصّہ سوم)

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ھندی و چینی سفالِ جامِ ماست — رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ھند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست
مسلم استی دل با قلیمے مبند — گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دلِ او یاوہ گردد شام و روم
صورتِ ماھی بہ بحر آباد شو — یعنی از قیدِ مقام آزاد شو
ھر کہ از قیدِ جہات آزاد شد — چون فلک در شش جہت آباد شد
بوئے گل از ترکِ گل جولانگر است — در فراخائے چمن خودگستر است

(مثنوی رموزِ بیخودی، بعنوان در معنی اینکہ چون ملّت محمّدیہ ۔ ۔ ۔ نہایت مکانی ندارد)

مثنوی رموزِ بیخودی میں اقبالؔ نے مسلم قومیت کے ممتاز ہونے اور اسلام کے زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہونے کا ذکر جداگانہ عنوانات سے کیا ہے اور بڑے افتخار اور وقار کے ساتھ کیا ہے ۔ اس تصوّر کی ابتدائی صورت اس مضمون کی اِس طرح ظاہر ہوئی:

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیّت کا اسلامی تصوّر دوسری اقوام کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے ۔ ہماری قومیّت کا اصل نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی بلکہ

ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔

اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلنے لینے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائلِ مخصوصہ و شمائلِ مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرّا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا، اس کی پولیٹیکل نشوونما میں بہت بڑا حصہ ہے لیکن اسلامی علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت کے انمول موتیوں کو رولنے کا کام، اور یہ وہ کام ہے جو نفسِ ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے، زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا، لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کا جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔

پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے۔ قومیت کا ملکی تصور جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں، اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے ․ ․ ․ ․ ۵۳

تعلیم کے موضوع پر اس مضمون میں، مضمون "قومی زندگی" میں بیان کیے ہوئے نکات کا اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ مغربیت اور دیگر الحاد آمیز خیالات سے دور رہنے کی تلقین ہے گویا علوم و فنون کی اسلامی مناہج کے بارے میں حضرت علّامہ کے وہ افکار بھی پختہ ہو رہے تھے جو کہ بعد میں

'جاوید نامہ'، مسافر، پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز' وغیرہ میں بیان ہوئے ہیں۔ مگر بقول اقبال ایک تیز نظر مصنف سعید حلیم پاشا نے اس پر ۱۹۱۸ء میں بڑے مبسوط طریقے سے لکھا تھا۔ اور انہیں اقبال نے 'جاوید نامہ' میں خراجِ تحسین پیش کیا اور اس سلسلے کی بات کو اتنا آگے بڑھایا پھر بھی موجودہ عالم اسلام کو حضرت علامہ کے افکار سمجھنے اور جذب کرنے کے لیے ابھی بہت عرصہ لگے گا۔

اس سلسلے میں تعلیم کا ایک مقصد اقبال یہ بتلاتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی کے بقول وہ دل و دماغ کو بدل کر اسلامی رنگ میں رنگ دے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ہماری قومی سرگرمیوں اور تعلیمی تگ و دو کا مقصد صرف اقتصادی اغراض و مقاصد ہی نہیں ہونا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک سوز و ہمدردی سے بھرے ہوئے دل کی زیادہ اہمیت ہے خواہ اس پر کتابوں کا بوجھ کم ہی ہو۔ اپنی ثقافتی اور تاریخی زندگی سے وابستگی اقتصادی خوشحالی سے زیادہ اہم ہے اور تحریکِ آزادی کے زمانے میں اقبال نے بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم کو بھی یہی لکھا تھا کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں مسلمان اقتصادی طور پر ہی خوشحال نہیں ہوں گے بلکہ وہ اپنی تاریخ و ثقافت کی بھی بہتر حفاظت کر سکیں گے۔ آج سیکولر بھارت میں آثارِ اسلامی کا جو حشر ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر حضرتِ علامہ کی یہ رائے کتنی برمحل اور صائب تھی۔

جس زمانے میں اقبال نے یہ خطبہ دیا اُن دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے لیے کوششیں زوروں پر تھیں جو کوئی دس برس بعد کامیاب ہوئیں۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام بھی اقبال کے نزدیک اسی خاطر ضروری تھا کہ وہ اعلیٰ پیمانے پر قوم کے فرہنگی ورثے کی حفاظت کر سکے گی اور مسلمانوں کی فکری راہنمائی کا فریضہ انجام دے گی۔

> "ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروغ کی تلقین کے لیے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ اقتصابات اور عمرانیات کے حقائق نفیسہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں

ہیں پوری دسترس رکھنی چاہیئے۔ الندوہ، علی گڑھ کالج، مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں، اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلم ہونا چاہیئے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ وہاں تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانۂ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانو کو ڈھلنا ہے۔

پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویرِ مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔۔۔"[۵۲]

اپنے مضمون 'قومی زندگی' میں اقبال نے عورتوں کی تعلیم پر جو کچھ لکھا تھا اس کا ذکر اس مضمون میں زیادہ واضح اور مخصوص صورت میں ملتا ہے۔ البتہ یہاں وہ بات زیادہ کھل کر کرتے ہیں کہ طبقۂ نسواں کو وہ مضامین پڑھائے جائیں جن سے ان کے مخصوص مشاغل میں کوئی فرق نہ آئے۔ اقبال مرد و زن کی اس حد تک مساوات کے قائل ہیں جس کی اجازت اسلام نے دی ہے۔ اس لیے وہ مغرب کے آزادیٔ نسواں کے تصورات سے اس مضمون میں بے زاری کا ایسے ہی اظہار کرتے ہیں، جیسے انہوں نے بعد کی تصانیف میں کیا ہے۔

میں نے علامہ اقبال کے ان دو مضامین کے چیدہ چیدہ نکات بیان کیے ہیں اور بعد کی تصانیفِ اقبال کی طرف اجمالی اشارے کیے ہیں۔

سیاسی امور پر اقبال نے ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں لکھے جانے والے اپنے دو الگ مقالوں میں بحث کی ہے۔ یعنی 'خلافتِ اسلامیہ' اور "اسلام بطور ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کے"۔

دیگر موضوعات میں سے اکثر کی ابتدائی تخیلی کیفیت ان دو مقالوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال کی برصغیر کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ غیر معمولی وابستگی، ان کا سوز و ساز و دردِ دل،

نیز ان کی ہمہ گیر بصیرت ان مقالوں میں بھی سمٹ آئی ہے۔ لہٰذا اقبال شناسی کے لیے ضروری ہے کہ اقبال کی نظم کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مصادر اور وضاحتیں

۱۔ اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد (۱۸۵۹ء ۔م ۱۹۴۰ء) وہاں ملازمت کے سلسلے میں متعین تھے۔ اس سفر کی یادگار اقبال کی نظم 'ابر' بھی ہے۔ (بانگ درا حصہ اول)

۲۔ مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی طبع دوم ۱۹۸۲ء طبع کردہ آئینہ ادب چوک ادبی انارکلی، لاہور۔ صفحہ ۴۷ تا ۹۹

۳۔ سعدی، گلستان

۴۔ (i) سید عبدالواحد معینی (مرتب) Thoughts and Reflections of Iqbal طبع دوم۔ لاہور ۱۹۷۳ء۔ آخری صفحات۔

(ii) ملک حق نواز کا مقالہ۔ مجلہ فنون اقبال نمبر دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۶ تا ۲۱

۵۔ کہیں کہیں مترجم اختصار برت گئے ہیں۔

۶۔ آئینہ ادب، لاہور کے زیر اہتمام۔

۷۔ مجلہ 'تحقیق'، لاہور۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء نیز تصانیفِ اقبال کا توضیحی و تحقیقی مطالعہ صفحہ ۴۴۴ تا ۴۶۸، دونوں مؤلفہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ اقبال نے تسامح سے خطبے کا سال ۱۹۱۱ء لکھا ہے جبکہ درست طور پر ۱۹۱۰ء ہے۔

۸۔ 'جاوید نامہ'، کلیات اقبال، فارسی: شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ طبع ۱۹۷۳ء اور بعد صفحہ ۷۹۰۔

۹۔ Elan Vital یا Survival of the fittest

All rights reserved

۱۰- اس مضمون میں 'شرائط' کا فارسی استعمال ہے بمعنی احوال و حالات۔

۱۱- کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۳ا تا ۱۵

۱۲- مقالاتِ اقبال صفحہ ۸۰۔

۱۳- کلیات اقبال، فارسی صفحہ ۶۹۶، ۶۹۷- دیکھیں قرآنِ حکیم ۹ : ۵۹

۱۴- رسولِ اکرمؐ کو حکیم عرب، اقبالؔ نے غالباً اسی مضمون میں لکھا ہے۔

۱۵- دیکھیں مثنوی اسرارِ خودی (سوال):

خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ الحذر از منتِ غیر الحذر

کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۲۳- واقعہ کے بارے میں اقبالؔ نے خود حاشیہ لکھ دیا ہے۔

۱۶- ملاحظہ ہو ۱۹۱۰ء اقبالؔ کی تاثراتی ڈائری Stray Reflections

اردو ترجمہ مع حواشی از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی 'شذراتِ فکرِ اقبال'، مجلسِ ترقیِ ادب

۱۹۷۳ء صفحہ ۱۱۴۔ بھارت میں 'بکھرے خیالات' کے عنوان سے ترجمہ شائع ہوا

(مترجم ڈاکٹر عبدالحق) مگر حواشی ندارد۔

۱۷- دوسری دو اشیاء خوشبو اور نماز ہیں:

آنکہ نازد بر وجودش کائنات ذکرِ او فرمود باطیب و صلوٰۃ

کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۹۴

۱۸- اقبالؔ عورت کے مقامِ مادری (امومت) کے بے حد قائل تھے۔

۱۹- قرآنِ مجید ۳ : ۴

۲۰- مقالاتِ اقبال، صفحہ ۹۵

۲۱- Political Thought in Islam

۲۲- Islam as a Moral and Political Ideal

۲۳- کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۵

۲۴- قرآنِ مجید- ۱۳ : ۹۴

۲۵- ایضاً- ۱۰ : ۹۴

۲۶- ایضاً- ۱۷۲ : ۷

۲۷- ڈاکٹر محمد خالد مسعود: اقبال کا تصورِ اجتہاد، حرمت پبلیکیشنز، راولپنڈی ۱۹۸۵ء

Iqbal Cyber Library All rights reserved ©2002-2006

۲۸۔ دیکھیں بشیر احمد ڈار کی کتاب 'انوارِ اقبال' اقبال اکادمی پاکستان۔

۲۹۔ کلیاتِ اقبال، فارسی، صفحہ ۹۸۲

۳۰۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۷۳ء و بعد، صفحہ ۵۵۵

۳۱۔ کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۷۰۰

۳۲۔ ایضاً صفحہ ۹۸۲

۳۳۔ یعنی بدھ مذہب جو ہند اور سیلون سے جاپان جا پہنچا۔

۳۴ و ۳۵۔ مقالاتِ اقبال صفحہ ۸۶ اور ۸۷ بالترتیب

۳۶۔ کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۸۴۲

۳۷۔ ایضاً صفحہ ۱۷

۳۸۔ اپنی ڈائری میں اقبال نے قوم یہود کے زعماء میں اسپینوزا اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا ہے۔ شذراتِ فکرِ اقبال، صفحہ ۹۲

۳۹۔ ایضاً، شذراتِ فکرِ اقبال۔ صفحہ ۸۹۔ یہاں اقبال افغانستان کے سے حائل (Buffer) ملک کے مستقبل کے بارے میں مذبذب ہیں۔ مثنوی مسافر میں بھی ہے (تمہید):

ریزہ ریزہ از سنگِ او مینائے او　　　آہ از امروزِ بے فردائے او

(کلیاتِ اقبال، فارسی صفحہ ۸۵۳)

۴۰۔ کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۱۲۵، ۱۲۴

۴۱۔ مقالاتِ اقبال صفحہ ۸۰

۴۲۔ کلیاتِ اقبال، فارسی۔ صفحہ ۶۳۲

۴۳۔ ایضاً صفحہ ۱۲۵

۴۳ الف۔ کلیاتِ اقبال (فارسی) صفحہ ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۶۶، ۶۶۹

۴۴۔ رسالہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے اور دیگر اہم کتب خانوں میں بھی۔

۴۵۔ اس کی سہ بارہ اشاعت ۱۹۲۲ء کے رسالہ Muslim Outlook کے کسی شمارے میں ہوئی تھی۔

۴۶۔ مقالاتِ اقبال، اور سہ ماہی اقبال، بزمِ اقبال لاہور بابت جنوری ۱۹۵۴ء

۴۷۔ ایم۔ وائی۔ ہاشمی (محمد یعقوب ہاشمی) نے مقالے کو حواشی کے ساتھ ۴۰ صفحے کی کتاب

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved ©2002-2006

کی صورت میں شائع کروایا ہے۔ دارہ Orientalia لاہور ۱۹۵۵ء۔

۴۸۔ یادبود اقبال، خانہ فرہنگ ایران، لاہور ۱۹۷۸ء میں۔ اور المعارف لاہور، اپریل و مئی ۱۹۸۴ء میں۔

۴۹۔ در بیان اینکہ مقصد حیات ...... :

تب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ عشق را ناموس و نام و ننگ دہ

۵۰۔ دیکھیں 'جاوید نامہ' (فلک عطارد) :

جز حرم منزل ندارد کاروان غیر حق در دل ندارد کاروان

من نمی گویم کہ راہش دیگر است کاروان دیگر نگاہش دیگر است

۵۱۔ مساوات آموز یں حکایت کا پہلا شعر یوں ہے۔

بود معمارے ز اقلیم خجند در فن تعمیر نام او بلند

۵۲۔ ..... ھم فقیرے ھم شہ گردوں فرے اردشیرے باروان بوذرے

۵۳۔ نظم 'وطنیت' (۱۹۰۸ء)، اسلام ایک اخلاقی و سیاسی تصور (۱۹۰۹ء) اور خطبہ 'ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر' (۱۹۱۰ء) میں بھی یہ مخالفت مشہور ہے۔

۵۴۔ مقالات اقبال صفحہ ۶؛

۵۵۔ فلک عطارد میں (بزبان سعید حلیم پاشا) ملاؤں کی تنقید اور علمائے حق کی تکریم والے اشعار دیکھ لیں۔

۵۶۔ مقالات اقبال۔ صفحہ ۷۶؛

W.W.W.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved ©2002-2006

علامہ اقبال کا ایک خصوصی انداز